

جگہ مانگنے آیا ہوں۔"

"تم تو ہمارے شار کار سپاٹنٹ تھے شوکی۔" ریاض اداسی سے بولا: "تم خود ہی ہمیں چھوڑ گئے تھے۔"

"شار کار سپاٹنٹ مائی فٹ۔"

"پھر تم نے کہا کہ ملک کا کوئی بھی اخبار تم سے لکھوانا اپنے لئے فخر سمجھے گا، اور تم ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔"

"اچھا اچھا۔" وہ بیک وقت ہستا اور غصے سے لرزتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا: "ٹھیک ہے۔ میں نے اپنے قلم پر ناز کیا اور منہ کی کھائی۔ ٹھیک ہے۔ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میرا ناز غلط تھا۔ اس سے تمھی لوگوں کی — جرنلزم کے خداوں کی جہالت کا علم ہوتا ہے۔"

"بیٹھ جاؤ شوکی۔" ریاض نے نرمی سے کہا: "کون کہتا ہے تمہارا ناز غلط تھا۔ آج بھی اگر تم چاہو تو فرست ریٹ روپورٹنگ کر سکتے ہو۔ صرف اگر تم اپنے احمقانہ خیالات کو —"

"فرست ریٹ؟" وہ چیخا: "یہ فرست ریٹ روپورٹنگ ہے؟ یہ جو تم کر رہے ہو یا کرو رہے ہو یا جو میں کرتا رہا ہوں؟ یہ تھڑا ریٹ سننی خیزی؟ یہ سینکڑ ریٹ نکشن؟ فرست ریٹ روپورٹنگ تم نے دیکھی ہی نہیں ریاض۔" "میں دنیا بھر کی اخباریں پڑھتا ہوں شوکت۔ اگر نہ بھی پڑھوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جرنلزم ایک بزنس ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اس بزنس کو آرٹ بنانا چاہتا ہوں۔ میں جرنلزم کو اوپر اٹھانا چاہتا ہوں۔ اس سطح پر لانا چاہتا ہوں جہاں لکھنے والے میں اور پڑھنے والے میں براہ راست تعلق قائم ہوتا ہے، جہاں دونوں فریق عمومیت کی زہریلی فضا سے نکل کر آزادی اور فہانت سے ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کر سکیں، جہاں

وہ ایک تہذیب یافتہ قوم بنیں۔ یہ احمقانہ خیالات ہیں؟“

ریاض کے انٹر کام پر چھوٹا سا بلب روشن ہوا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سونچ آن کیا تو اس کی سیکر ڈری کی آواز آئی: ”پروفیسر شریف تشریف لائے ہیں۔“ ”پانچ منٹ۔“ ریاض نے جلدی سے کہا اور سونچ آف کر دیا۔ پھر اس نے جھک کر میز کی پٹھلی دراز سے کاغذوں کا ایک پلندہ، جس پر گرد کی ہلکی سی تہ جمی تھی، نکلا اور میز پر رکھ دیا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں ہلکی سی آکتا ہے تھی:

”آج سے ٹھیک ایک برس پہلے ہم اس مسئلے پر بحث کر چکے ہیں، تمہیں یاد ہو گا۔“ اس نے کہا: ”اب اسے دوہرانے سے کوئی فائدہ نہیں، تمہارے مضمون“ اس نے پلندے کی طرف اشارہ کیا: ”ایک سال سے میرے پاس پڑے ہیں اور میں انہیں چھاپنے کی جرات نہیں کر سکا۔ مجھے ادب سے زیادہ واقفیت نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اچھا ادب ہو، مگر یہ اچھی جرنلزم نہیں، میں جانتا ہوں۔ تمہارے پاس ٹیلنٹ ہے شوکت، میں مانتا ہوں۔ مگر تمہیں بنس کی کوئی سمجھ نہیں۔ میں تم پر کوئی الزام نہیں لگا رہا، صرف اپنی پوزیشن واضح کر رہا ہوں۔ پلک جو کچھ مانگتی ہے ہم اسے وہی کچھ مہیا کرنے پر پابند ہیں۔ جرنلزم اسے ہی کرتے ہیں، دنیا بھر میں۔“

”ریاض“ وہ ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا: ”مجھے ایک چانس دو۔ صرف ایک۔ مجھے یقین ہے کہ میں جرنلزم میں انقلاب لا سکتا ہوں۔ مجھے بنس کی سمجھ نہیں، مگر میں پلک کو سمجھتا ہوں۔ پلک اتنی بری نہیں جتنی ہم نے بنارکھی ہے۔ پلک کی عادات کو ہم لوگ ہی بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ آج نہیں توجھ مہ کے بعد، ایک سال کے بعد پھر میری وہی ریڈر شپ ہو گی جو پہلے کبھی تھی۔ میں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں۔“

”ایک بات بتاؤ شو کی۔“ ریاض نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا:
”یہ دیوانگی آخر کس نے تمہارے دل میں ڈالی ہے؟“
”دیوانگی؟“

”یہ آرٹ وارٹ کا چکر۔“

”اس بات کو چھوڑو۔“

”یہ اچھا بھلا لکھتے لکھتے ایک دم تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ڈھنگ سے کچھ
لکھ کر ہی نہیں دیتے؟“

”تمہیں پتا ہے ریاض کہ ہماری جرنلزم کو اس وقت تھوڑے سے تخلی
کی کس قدر ضرورت ہے؟ کہ آج کی عوامی زندگی کی روپورٹنگ میں اور شاک
ایکچھ رپورٹ میں کوئی فرق نہیں رہا؟ کہ ہم نے رائے عامہ کو تباہ کر کے رکھ دیا
ہے؟“

ریاض خاموشی سے پاپ بھرتا رہا۔

”میں کوئی بھاری معاوضہ نہیں مانگتا۔ میں اپنے کیریئر کو بالکل نئے سرے
سے شروع کرنے پر راضی ہوں۔ تم آہستہ آہستہ میری قیمت بڑھا سکتے ہو۔ بہت
آہستہ آہستہ ریاض۔ مجھے ایک چانس دو۔“

”میں یہ رسک نہیں لے سکتا بھی۔“ وہ اچانک اکتا کر بولا: ”ایسا مواد
پیلک کو میا کر کے ہم بزنس میں نہیں ٹھہر سکتے۔ میں دو پرچے اور خرید رہا ہوں،
کچھ اور بھی فیچر بڑھا رہا ہوں۔ تمہارے لیے ایسے ایسے دیوانے تجربے نہیں کر
سکتا۔ آج مارکیٹ میں کمپیشن کتنا ہے۔ ایک بار پسپر بیٹھ جائے تو برسوں کوئی
نہیں پوچھتا۔ تمہارے سامنے کئی مثالیں ہیں۔“

”تم پچھلی بالوں کو نہیں بھولے ریاض۔“ وہ بھڑک اٹھا، پھر فوراً ہی کرسی
پر آگے ہو کر بیٹھ گیا اور ملتجیانہ لمحے میں بولا: ”مگر ریاض، کبھی ہم — ہم

کبھی دوست بھی تھے۔ یاد ہے؟ میں نے تین راتیں جاگ کر تمہارے لیے وہ نوٹ میگزین میں لکھا تھا۔ یاد ہے؟ میں کئی ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہیں آج بھی وہ نوٹ حرف بہ حرف یاد ہے۔ مجھے آج بھی وہ دن اچھی طرح سے یاد ہیں، ابھی جیسے کل ہی کی بات ہے کہ تمہارا کپتانی کا چکر چلا تھا اور تم میرے پاس آئے تھے کہ شوکی پالیٹکس چل پڑی ہے، اور کچھ لوگ اشرف کو سپورٹ کر رہے ہیں۔ تو میں نے کہا تھا: ”کوئی بات نہیں ریاض،“ ایسا ہے تو ہم بھی پالیٹکس چلا میں گے۔“ اور پھر میں نے میگزین میں اور ٹیم میں اور اندر اور باہر یاد ہے؟ میں نے —

”شوکت میرا خیال ہے تم تھوڑے سے دیوانے ہوتے جا رہے ہو۔“

ریاض کا چہرہ دبے ہوئے غصے سے لال ہو گیا۔ ”میری بات سنو۔ میں تمہیں کچھ ایڈوانس دے دیتا ہوں۔ کچھ عرصے کے لیے شر سے باہر کسی خاموش مقام پر چلے جاؤ۔ اپنی صحت کا خیال کرو اور ٹھنڈے دل سے اپنے کام کے بارے میں سوچو۔“ اس نے جیب سے سیاہ نفیس چڑے کا بھاری بُوہ نکالا۔ پھر اس میں سے سوسو کے دس نوٹ گن کر نکالے اور انہیں میز کے شیشے پر رکھ کر اس کی طرف دھکیل دیا۔ پھر اس نے چونک کر اس کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے اور کانپتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھا اور جلدی سے بولا: ”کچھ اور مت سمجھو یہ ایڈوانس —“

شوکت کے ہونٹوں سے ابلتی ہوئی گالی نکلی اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی تیزی سے ریاض نے انٹر کام کا سوچ آن کیا اور بولا: ”پروفیسر صاحب کو آنے دو۔“

”لیں سر۔“ اس کی سیکرٹری کی آواز آئی۔ پھر ریاض اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا:

”میرے دوست مجھ سے بغیر اپا شمنٹ کے بھی مل سکتے ہیں، مگر جن سے میری اپا شمنٹ ہوان سے ملنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔“

دروازہ کھلا اور ادھیڑ عمر کا پروفیسر اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے جمیلہ تھی۔ اسے دیکھ کر ریاض ایک لمحے کے لیے چونکا پھر بے خبر بن گیا اور ہاتھ پھیلا کر پروفیسر کی طرف بڑھا۔

”آئیے پروفیسر صاحب، آئیے۔“

شوکت چند منٹ تک اسی طرح مٹھیاں کے، دانت پیسے، آنکھیں خون کیے، جیسے جست بھرنے کے لیے تیار کھڑا رہا۔ پھر جمیلہ کی انگلیوں کو اپنے بازو پر محسوس کر کے یکنخت ڈھیلا پڑ گیا، جیسے بہت سارا خون اس کے بدن سے شر شر کرتا ہوا نکل گیا ہو۔ اس کی آنکھیں ماند پڑ گئیں اور وہ سر جھکا کر جمیلہ کے پیچھے ریاض کے دفتر سے نکل آیا۔

باقی کارستہ انسوں نے خاموشی سے طے کیا۔ بس میں بیٹھا وہ ٹھہری ہوئی نظروں سے باہر کے اڑتے ہوئے نظر کو دیکھتا رہا۔ فلیٹ میں پہنچ کر وہ سیدھا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جمیلہ کھڑکی میں کھڑی سڑک پر بھاگتی ہوئی موڑ گاڑیوں کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ اس کے پاس چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی۔

اس نے خاموشی اور تندی سے کئی بار اس کو چوما، پھر اس کی کمر پر ہاتھ دھرے دھرے لیٹ گیا۔

بعد میں وہ دیر تک چارپائی کے پاس کھڑی اسے نیند میں گرے سانس لیتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کی گدالے شیشے کی سی آنکھیں نیم واٹھیں اور وہ منہ کھولے بے خبر سو رہا تھا، اور اس کا سنگ مرمر کا سافید اور نازک اور قوی بدن، گول گول ابھرے ہوئے شانوں والا اور لمبے لمبے پتلے بازوؤں والا اور سنہرے بالوں سے ڈھکے ہوئے فراخ سینے والا ہموار پیٹ اور تنگ کولہوں والا اور

پھر کتے ہوئے مضبوط پھوں والا اور مچھلی دار گول رانوں والا اور لمبی لمبی پنڈلیوں والا، مغرور اور محظوظ بدن بے دم ہوا پڑا تھا۔ وہ چارپائی کو پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ رونے لگی۔

کچھ دیر کے بعد اس نے اٹھ کر دیوار پر لکھتے ہوئے شیشے میں اپنے بالوں اور چہرے کو درست کیا اور آہستہ سے فلیٹ کا دروازہ بھیڑ کر باہر نکل گئی۔ جب وہ انھا تو دھوپ ڈھل رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر پسند کے نئے نئے قطرے ابھر آئے تھے۔ ایک بڑی سی سبزرنگ کی کمھی روشن دان کے شیشوں پر مستقل سرمار رہی تھی۔ وہ سیدھا لیٹا اس کے پروں کی یکساں، اداں بھجنہنا ہٹ کو سنتا اور کمرے میں پھیلے ہوئے سہ پر کے اجائے کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ نیچے سڑک پر موڑ گاڑیاں نیلے دھوئیں کے غبار چھوڑتی ہوئی اڑی جا رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر لوگ تیز تیز چل رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ دور سے ایک دوسرے کو پہچان کر ہاتھ ہلاتے اور بے دل سے نہ کر گزر جاتے۔ ایک بھاری بدن کی بڑھیا ایک بچے کو انگلی سے لگائے اسے ہجوم سے بچاتی ہوئی، کبھی اس سے اور کبھی اپنے آپ سے باتیں کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ایک بس آکر رکی۔ اترنے والے چھلانگمیں لگا لگا کر اترے اور اپنے اپنے راستوں پر بڑھ گئے۔ چڑھنے والوں نے لائن بنائی، پھر ان میں یکنہت کھلبلی مجھ گئی اور وہ ایک دوسرے کو دھکلیتے، کوستے اور پھلانگتے ہوئے بس میں سوار ہونے لگے۔ ایک گد اگر عورت، جو باری باری ہر ایک کے آگے ہاتھ پھیلا رہی تھی، ان کے زرغنے میں آگئی اور دھکے کھانے لگی۔ ایک کتابے خیالی سے سڑک پار کرنے لگا۔ پھر بس شور مچاتی اور دھوئیں کے بادل اڑاتی ہوئی چل پڑی۔ اس کے منہ میں پیلی بد مزگی پھیلنے لگی۔

”پیسہ!“ وہ انتہائی بد دل سے بولا: ”پیسہ!!“

پھر وہ چند لوگوں کو چونکتے اور غور سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر کھڑکی سے ہٹ آیا۔ اس نے بد مزگی سے اپنے آپ پر نظر ڈالی اور کپڑے پہننے لگا۔ پھر وہ فلیٹ کا دروازہ کھلا چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

فت پاتھ پر گداگر عورت نے اس کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ ڈھلتی ہوئی زرد ھوب میں فلیٹوں کی عمارتوں کے سائے سڑک کے آرپار لیٹھے ہوئے تھے۔ زرد ساری پہنے ایک جوان عورت لمرا کر چلتی ہوئی اس کے پاس سے گزری جو آنکھوں کو بڑی بھلی لگی۔ پھر ٹھہری ہوئی نظروں میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے رک کر، پیچھے مڑ کر اس عورت کو دیکھا جو چھوٹے چھوٹے قدم دھرتی، بازو ہلاتی، بڑی حیا سے سینہ اٹھائے کمر لرا تی ہوئی ماضی کی مانند پرے چلی جا رہی تھی اور جی کو بڑی ہی اچھی لگ رہی تھی۔ جب وہ اپنے فلیٹ میں گھس گئی تو وہ پھر منہ اٹھا کر ایک طرف کو چلنے لگا۔ ہاں، چند سال تک وہ بہت ہی خوش رہا تھا، اس نے سوچا۔ جمال کو پالینے کے بعد چند سال تک اسے ہوش ہی نہ آیا تھا۔ اپنے آپ کو اس کے قابل ثابت کرنے کے لیے اس سے جو بھی ہو سکا اس نے کیا تھا۔ اس نے مبالغہ آمیز سننی خیز روپورنگ کی بہترین شکل ایجاد کی تھی اور ملک بھر میں مشہور ہو گیا تھا۔ اس کا روزانہ کالم ملک کے سب سے بڑے اخبار میں چھپتا تھا اور اس کی مجموعی ریڈر شپ ایک لاکھ کے تجھیں میں تھی۔ بڑے بڑے عالی شان ایڈیٹر ہاتھ پھیلائے اس کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے اور وہ سیدھے منہ ان سے بات نہ کرتا تھا۔ اس وقت وہ ایک شاندار فلیٹ میں رہتے تھے جسے جمال نے قدیم سینش فرنچ پر اور قرمذی رنگ کی دیزائنگ و لوٹین کی ڈریپری سے آراستہ کیا تھا، جس کے کچن میں چھفت اونچا تین فٹ چوڑا رینفریجریٹر تھا اور جمال بڑی شان سے سٹول پر بیٹھ کر بھلی کے چولھے پر شین لیں سٹیل کے برنسوں میں کھانا پکاتی تھی (ایک سال کے مختصر عرصے میں یہ سب کیسے ہوا ہو

گیا؟) جس کے سفید ٹیلیفون کی گھنٹی دن رات بجا کرتی تھی اور وہ رائٹنگ نیبل پر جھکا، ریسیور انھا کر بڑے اعتماد سے بڑے مصروفیت کے لمحے میں بات کیا کرتا تھا۔ ہاں، چند سال تک وہ بہت خوش رہا تھا۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ وہ جمال کی خاطر کر رہا تھا، جمال — (ایک بہت پرانا، جگہ گاتا ہوا منظر اس کی آنکھوں میں ابھرا: اپریل کے آخری دن تھے اور بہار کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ فائل کے امتحان سے فارغ ہو کر جمال نے اپنے گھر پر سب دوستوں کو چائے کی دعوت دی تھی۔ ان کے باغ میں بلند قامت سفیدے کے درخت پر سکوت کھڑے تھے اور سنہری سہ پہر پہ بدلتے ہوئے موسم کا جادو چپ چاپ چل چکا تھا۔ اور اندر وہ دوستوں کے جھرمٹ میں بڑے اطمینان سے چل پھر رہی تھی۔ اپنے بڑے سے ڈرائیک روم کے جس کونے میں وہ پہنچتی ”جال — جال“ کی مانوس آوازیں ابھرتیں اور نوجوان مسرور تھے بلند ہوتے اور یوں اس خاص مقام پر اس کی موجودگی کی ہر ایک کو خبر ہوتی۔ ایک ایک لڑکے کو، جو اس روز اس تقریب پہ مدعو تھا، اس بات کا علم تھا کہ وہ شوکت کی تھی اور شوکت اس کا تھا مگر اس کے باوجود حسد کا جذبہ ناپید تھا۔ وہ سب اس بے راز نہیں میں گھلے ہوئے تھے جو جمال کا حصہ تھی اور مکمل طور پر خوش اور مطمئن تھے، اس لیے کہ جب وہ چلتی تھی تو کمرے کی ساری آرائش ہوا کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور جب وہ کسی کے سامنے رک کر کوئی معمولی سی بات کرتی تھی تو اس شخص کے پاس جیسے زندگی کا سارا سچ اور سبھاؤ چلا آتا تھا اور اپنے ساتھ کاملیت کا وہ احساس لاتا تھا جو دل میں سرور اور ٹھہراو پیدا کرتا ہے، اس لیے کہ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جسے اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے کسی مرد سے محبت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف مرد اس سے بات کر کے، اس سے دوستی کا دم بھر کے اپنی تکمیل کرتے تھے۔ آخر اپریل کی اس

زریں سہ پر کو چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامے، کھڑکی کے پاس اکیلے کھڑے کھڑے اس نے حیرت سے اس سارے منظر کو دیکھا تھا اور اس پر وہ لمحہ آیا تھا — وہ بے مثال اور لا فانی لمحہ جس میں اس نے پہلی بار اس لڑکی کے وجود کی اصل موسیقی کو محسوس کیا تھا، اس کی اصل منی کو، اس کے تار و پود کی اصل بُنتر کو جیسے بھلی کے ایک چکارے میں دیکھ لیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو نوجوانوں کے خوابوں میں باکرتی ہیں اور کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتی ہیں، اور جب دیکھنے میں آتی ہیں تو چاہے دور ہوں چاہے قریب ہوں چاہے کسی اور کی ملکیت ہوں اپنی طبیعت کے تپاک سے اور اپنے جذبے کی حرارت سے اور اپنی اندر ورنی دمک سے اور دل سوزی سے اور اپنے ذہن کی بنیادی سادگی کی وجہ سے عمر بھر کی یاد بن جاتی ہیں۔ وہ عورتیں جو درحقیقت کسی ایک کی ملکیت نہیں ہوتیں بلکہ دنیا بھر کے مردوں کی مجموعی جمالیاتی جائیداد ہوتی ہیں — وہ جنمگاتا ہوا لمحہ آج بھی اس کے ذہن میں روشن تھا — یہ سب کچھ وہ جمال کی خاطر کر رہا تھا جواب اس کی بیوی تھی اور وہ دنیا کا خوش قسمت ترین شخص تھا۔

اسی زمانے میں ریاض کمیں سے شر میں آن وارد ہوا تھا۔ وہ بنگال کے دورے سے لوٹا تو اس نے ریاض کو اپنے ڈرائیور میں بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ پرانے دوستوں کی طرح، سب کچھ بھول بھلا کر، تپاک اور گرمجوشی سے ملے۔ اس نے دیکھا کہ ریاض اب کافی سنجیدہ ہو چکا تھا اور اس کے لب و لمحے میں ہلکی اداسی کی جھلک تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک روزنامہ خرید رہا ہے اور اس میں تازہ خون ڈال کر اسے شر کا سب سے بڑا اخبار بنانی چاہتا ہے، جس کے لیے اسے شوکت کی مدد کی بھی شاید ضرورت پڑے گی۔ اس نے اسے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا اور دیر تک پرانے وقتوں کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد

اس نے باقاعدگی سے ریاض کے اخبار کے لیے لکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک ہی سال کے اندر اندر وہ شر کے تین بڑے روزناموں میں شمار کیا جانے لگا۔ اب ریاض نے اخبارات کی ایک لڑی بنانے کا فیصلہ کیا اور آغاز کے طور پر ایک ہفت روزہ اور ایک پندرہ روزہ پرچہ نکلا۔ یہ دونوں پرچے بھی بڑے کامیاب ثابت ہوئے۔ ان دونوں میں ان دونوں پر ایک بار پھر دلوں کی ہمسایگی کا وہ مختصر سادور آیا تھا۔ جو بہت پہلے کی یاد دلاتا تھا۔ ہاں، چند سال تک وہ بہت ہی خوش رہا تھا۔

مگر ان دونوں میں ہی فضا کے سنبھلے زرد رنگ میں ہلکے نیلے رنگ کی آمیزش شروع ہو گئی تھی۔ گواں دونوں میں اسے پتا بھی نہ چلا تھا، مگر اب یاد کرتا تھا تو بڑا صاف یاد آتا تھا۔۔۔۔۔ وہ وجود کے ثابت و سالم ہونے کا ایک طرح کا احساس، وہ ساری شخصیت کے یک جا اور مکمل اور بھرے پرے ہونے کا احساس جو لڑکپن میں کبھی وضو کر کے نماز پڑھنے کے بعد (نماز کے دوران میں نہیں، بعد میں) ہوا کرتا تھا اور اس وقت تک رہتا تھا جب تک کہ وضو کسی نہ کسی طرح ٹوٹ نہ جاتا تھا اور جو اولین جوانی کے زمانے میں اس وقت اور صرف اس وقت ہوتا تھا جب کہ وہ کہانی لکھتا تھا۔ اور بخیر و خوبی اسے ختم کر لیتا تھا، وہ وجود کے ثابت و سالم ہونے کا احساس جو بدن میں بڑا سکون اور بڑی قوت پیدا کرتا تھا۔ اور وہ ہمیشہ اسے ملتی کرتا آیا تھا۔ وہ کامیابی کے راستے پر تیزی سے بڑھا جا رہا تھا، اور کبھی کبھی جب دل کے اس بوجھ کو محسوس کر کے ٹھنک کر رک جاتا اور اخبار کی روپورٹ کو ادھورا چھوڑ کر قلم میز پر رکھ دیتا اور کرسی سے نیک لگا کر سینے کو صاف کرنے کی خاطر اس سنبھلے زرد رنگ کو یاد کرتا اور اس نادر و نایاب احساس کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے کہانی لکھنے کا ارادہ کرتا تو فوراً اسے (غیر شعوری طور پر) جر نلزم میں اپنی اوپنجی (چنانچہ اتنی

ہی نازک) حیثیت کا اور اپنے اعلیٰ معیار زندگی کا خیال آ جاتا اور ساتھ ہی اسے وقت کی کمی کا احساس ہوتا اوار وہ ہمیشہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا: ”اچھا، اس کے بعد سسی۔“ اور قلم اٹھا کر رپورٹ پر جھک جاتا۔ یوں ہمیشہ وہ اس کام کو کسی انجانے مستقبل پر اٹھا کر رکھتا رہا تھا۔ کتنی ہی بار، کتنے ہی ایسے چمکتے دمکتے ہوئے روشن خیالات کو اس نے ذہن کے کونوں کھدروں میں دبایا تھا، اس خیال سے کہ مستقبل قریب میں معقول مالی فراغت حاصل کر لینے کے بعد جب وہ اس قابل نفرت کام کو چھوڑ دے گا (یا بہت کم کر دے گا) اور اسے بہت سافا تو وقت ملے گا تو وہ دل جمعی اور سکون کے ساتھ اپنے ان سارے ٹھٹھاتے ہوئے روشن ستاروں کو ایک خوبصورت لڑی میں پروئے گا اور اس کھوئے ہوئے حیات بخش احساس کو دوبارہ حاصل کر لے گا۔ وہ وقت کبھی نہ آیا تھا۔

وہ اپنی اس دیوانی دوڑ کے چکر میں (جیسے کسی سحر کے زیر اثر) کبھی بھی نہ کھتم سکا تھا اور اس کے ذہن کے وہ روشن کونے آہستہ آہستہ بجھتے گئے تھے۔ حتیٰ کہ ایک روز قلم گھتے گھتے وہ ایک لختے کے لئے، جیسے صرف دم لینے کو، رکھتا اور پھر نہ چل سکا تھا۔ — جیسے کہ انہیں اپنے روای رکھنے والے تیل کے ختم ہو جانے کے بعد بھی اپنی گرمی میں کچھ دیر تک رگڑ کھاتا ہوا چلتا رہتا ہے مگر جب بند کیا جاتا ہے تو یک لخت جہاں کا تمہارا جام ہو جاتا ہے اور پھر نہیں چل پاتا۔ — اس وقت اس نے دہل کر اپنے اردو گرد نظر دوڑائی تھی اور چاروں طرف سے اس گمرے گدلے نیلے رنگ کو اٹھاتے ہوئے دیکھ کر دغنا۔“ اسے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ وہ دل کو ہلکا رکھنے والا سنہرا زرد رنگ اب قطعی طور پر زمانہ ماضی بن چکا تھا۔

اس کے بعد وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تین روز تک قلم ہاتھ میں پکڑے میز پر پھیلے ہوئے سفید کاغزوں پر نظر جمائے بیٹھا رہا تھا اور ایک لفظ تک نہ لکھ

پایا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کا کونہ کونہ چھان مارا تھا، مگر کوڑے کرکٹ کے اس ڈھیر سے اسے زندگی کے رس کا قطرہ تک دستیاب نہ ہو سکا تھا۔ پھر کہانی کی تلاش سے عاجز آ کر اس نے کہا تھا: ”اچھا میں جرنلزم کو آرٹ ہناؤں گا۔“ اس وقت سے اس کی گراوٹ شروع ہوئی تھی۔

سکرچ کر کے ایک تیز رفتار کار کو بریکیں لگیں اور سٹرینگ و ہیل پر بیٹھے ہوئے خوش پوش نوجوان نے سر باہر نکال کر بے ضرری گالی دی وہ سر اٹھا کر شرمندگی سے ہنسا اور بھاگ کر سڑک پار کر گیا۔ اب سورج غروب ہو چکا تھا۔ فٹ پاتھ پر ابھی تک لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ وہ چلتا چلتا رک گیا اور نظریں اٹھا کر افق پر دیکھنے لگا۔ اس شر کی شام ہمیشہ اس کے دل کو بڑی اچھی لگی تھی یہ ماضی کی ان لمبی لمبی ہولے ہولے رنگ بدلنے والی شاموں کی طرح کی شام نہ تھی۔ یہاں جب تک سورج غروب نہ ہوتا تھا دن بڑا کھلا اور روشن کھڑا رہتا تھا، اور جو نہیں سورج ڈوبتا تھا ایک عجیب و غریب، ناقابل بیان قسم کا رنگ گلابی اور سرخ اور آتشی اور نیلی نیلی لبروں والا کاسنی۔ یک بیک سارے آسمان پر پھیل جاتا تھا اور رات صرف چند منٹ دور ہوتی تھی۔ ان چند منٹوں میں شر کی ساری ابلتی ہوئی آبادی کی حرکت ہتم جاتی تھی (یا کہ صرف تھمتی ہوئی محسوس ہوتی تھی؟) اور سڑکوں کے کنارے بھلی کے بلبوں کی قطاریں دم بھر میں جل اٹھتی تھیں اور موڑ گاڑیوں کی بیان جلنے اور بجھنے لگتی تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے شر بھر کا رنگ و روپ بدل جاتا تھا، یہاں تک کہ لوگوں کی آوازوں میں اور ان کی چال ڈھال میں اور ٹریفک کے شور تک میں غروب سے پہلے اور غروب کے بعد کا فرق محسوس کیا جا سکتا تھا۔ یہ چند منٹ وہ حد فاصل تھے جو دو مختلف شروں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے تھے۔ وہ ”نو مین زلینڈ“ تھے جس پر کھڑے ہو کر اس شر کی مخصوص، مستقل، اندر ہونی دھڑکن کو محسوس

کیا جا سکتا تھا۔ وقت کے اسی مقام پہ، رات کے کنارے پر کھڑے ہو کر بارہا اس نے اس آبادی کی تیز و تندر بے رحم اور اداس کر دینے والی تال کو سنا تھا اور اس کی سرد ہمراہ کو اپنی ہڈیوں میں اترتے ہوئے اور دل کی سانس کو مختصر ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ یہ موسيقی اب اس کے لہو میں دوڑنے لگی تھی۔ اب وہ انہیں میں سے ایک تھا۔ اس نے جانی پچانی، لا تعلق نظریں چاروں طرف پھینکیں۔ کرکٹ کی ایک گیند سن سے اس کے کان کے ایک انچ کے فاصلے پر سے گزری۔ وہ جبلی طور پر اپنے سر کو بچانے کے لئے جھکا۔ لڑکوں نے بلے ہوا میں پھینک کر خوشی کا ایک نعروہ لگایا۔ وہ ان سے بچتا بچاتا ہوا چل پڑا۔ آبادی کی رفتار ابھی تھی ہوئی تھی۔ یکبارگی اس کے سر پر بجلی کے تقموم کی قطار کی قطار دور تک روشن ہو گئی۔ وہ سمسم کر دائیں بازو کی ایک لین میں، جہاں کارپوریشن کی بتیاں ابھی نہیں جلی تھیں، داخل ہوا۔ یہ نیم تاریک لین سنان پڑی تھی اور کوئی بندہ بشر دکھائی نہ دلتا تھا۔ صرف سمندری ہواشان شاہ کرتی ہوئی چل رہی تھی اور ردی اخباروں کے ورق اس کی نانگوں سے لپٹتے ہوئے، اس کے آگے آگے دور دور تک اڑے جا رہے تھے۔ دو رویہ فلیٹوں میں ایک ایک کر کے بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔ ایک دو منزلہ فلیٹ کی روشن کھڑکی میں سرخ پرده پھڑ پھڑا رہا تھا اور اندر سے ریڈیو کے بجھنے کی آواز آ رہی تھی۔ بنگ کراسی "ہندوستان" گا رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو کر ماضی کے اس نفے کو سننے لگا۔ کھڑکی میں ایک عورت نمودار ہوئی۔ اس نے جھک کر باہر جھانکا، پھر اندر کسی سے کوئی بات کی اور ہلکا سا تقصیر لگا کر ہنسی۔ کارپوریشن کی بتیاں بھک کر کے جل اٹھیں اور ساری لین روشن ہو گئی۔ وہ سمسم کر چل پڑا۔ اب رات پڑ رہی تھی اور شرکی اصل دھڑکن — اپنی مستقل جگہ پر — واپس بیک گراونڈ میں پہنچ چکی تھی۔ موڑ گاڑیاں چکا چوند پیدا کرنے والی بتیاں

آنکھوں میں ڈالتی فرائے سے گزرتی جا رہی تھی۔ کوئی کوئی گاڑی اندر سے روشن تھی۔ منہ میں سگار (دابے) شارک سکن کے جیکٹ پہنے تو مند مرد سینئرنگ وہیل پر بیٹھے تھے۔ بازو میں ادھیر عمر عورتیں زرتار ساریاں پہنے بیٹھی طہانیت سے باہر دیکھ رہی تھیں، پچھلی سیٹوں پر نو عمر لڑکیاں اور لڑکے بڑے دھیان سے کوکس پڑھنے میں مصروف تھے۔ خوش شکل، خوش پوش اور صحت مند کنے اپنی اپنی "آنکم بریکٹ" والے کنبوں سے ملاقات کرنے، ان کے ساتھ کھانا کھانے، یا ان کے ہمراہ پکجروز جانے کے لیے اڑے جا رہے تھے۔ وہ دیر تک سڑک کے کنارے رکا ٹریفک کے تھنے کا انتظار کرتا رہا، پھر گھبرا کر چل پڑا۔ آگے بانکے بدنوں والے نوجوانوں کے گروہ (تگنگ پتلونیں پیٹوں پر ہاتھ) جگہ جگہ کھڑے راہ جاتی لڑکیوں سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ خوش نما جسموں اور تگنگ لباسوں والی نو عمر لڑکیاں لب چھپائے، پیٹ میں ہستی ہوئی لرا کر پاس سے نکلی جاتی تھیں۔ یہ منظر بھی اس کے دل کو بڑا اچھا لگا اور وہ رک کر انہیں دیکھنے لگا۔ سامنے بڑی بڑی دکانیں تھیں جن میں لوگ ہجوم در ہجوم داخل ہو رہے تھے، نکل رہے تھے۔ ایک کتابوں کی دکان تھی جس میں کبھی کبھار کوئی جانقتا اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر لا تعلق انداز میں چلنے پھرنے لگتا، جیسے عجائب گھر میں گھوم رہا ہو۔ ٹریفک آہستہ آہستہ دھیما ہونے لگا۔ وہ دوڑ کر سڑک پار کر گیا۔ اب فٹ پاٹھ پر اس کے آگے اور پیچھے ایک اڑدھام تھا۔ اس ہجوم میں طالب علم تھے جو دن بھر روزی کمانے کے بعد اب نائٹ سکولوں کو آ اور جا رہے تھے، اور بیڑی پینے والے غلیظ لکھ پتی تھے جو اپنے اپنے شاکوں کو سیل کرانے کے بعد اب پھر ——"سالا" اور "گھپلا" اور "بھاؤ" اور "بازار" اور "تیز" اور "مندا" کر رہوئے —— اسی کی باتیں کر رہے تھے (یہ اس شہر کی مخربے پن کی زبان تھی جو سانس کی طرح اس کے بدن میں چلتی تھی، جسے سن کر ایک ایسے

مردہ خچر کے ڈھانچے کا تصور آتا تھا جو یک بیک مردار خور گدھوں کو جھٹک کر اٹھ کھڑا ہو اور آبادی میں آنکھے اور زور زور سے ہنہنا نا شروع کر دے اور جسے سن کر آبادی کا خون سوکھ جائے) اور عورتیں تھیں جو پلاسٹک کے چمکدار پرس جھلاتی، اپنے بے تاثر، خوبصورت چہرے اٹھائے خرید و فروخت کرتی پھر رہی تھیں۔ اور آنکھوں تھے جو پھیری لگانے والوں کی طرح اپنا ذہن لندھوں پر اٹھائے پھرتے تھے، اور چھوٹے چھوٹے الہکار تھے۔ جو زندگی کی بے حرمتی کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ ایک ایک پان کھا کر ساری ساری شام وقت ضائع کرتے پھرتے تھے، اور رکشا والے گدیوں پر اٹھے ہوئے، پینڈلوں پر جھکے ہوئے سائیکل چلائے جا رہے تھے اور بڑھی امریکن ٹورسٹ عورتیں انہیں دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھیں، اور گداگر بچے بھیک مانگ رہے تھے، اور یہ روں روں، گری پڑی مخلوق منہ کھو لے، آنکھیں بند کئے، وقفے وقفے پر ہڑپ کرتی ہوئی، مورکھوں کی طرح جیبوں میں ہاتھ ڈالے سکے کھنکھناتی ہوئی، بے خبری سے ہنستی ہوئی ادھر سے ادھر آ جا رہی تھی۔ وہ چاروں طرف نظر روڑا تا، جھینپ جھینپ کر ہنستا ہوا، انسانی تعلقات کے ظلم کی کیسٹیل حروف میں لکھی ہوئی اس ان پڑھی داستان سے آنکھ چرا تا، بچتا بچتا ہوا لفڑتا گیا۔ رستے میں بست سی روشن اور نیم روشن جگہیں آئیں۔ ایک نیم روشن جگہ پر اس نے ایک پان والے کوتن تنا اپنی دکان میں بیٹھئے، سر جھکائے پان لگاتے دیکھا اور اس کے ریڈیو پر ایک بہت پرانی اور مانوس دھن سنی جو یاد کی مانند اس کا تعاقب کرنے لگی۔ اس نے بار بار ذہن پر زور دے کر اس پر نور دھن کو یاد کرنے کی کوش کی مگر ناکام رہا۔ چلتے چلتے اب وہ کھلے کھلے بنگلوں والے پر فضاعلاقے میں آنکلا تھا جس کی سرڑکوں پر اندھے اندھے بلب دور دور جل رہے تھے۔ بنگلوں کے سر بزرگان برقی مقاموں کی روشنی میں آرام سے لینے سائنس لے رہے تھے۔ دروازوں پر رنگیں پردے

سکون سے پھر پھرا رہے تھے۔ اندر ان کے مکین بیٹھے تھے۔ سرکاری عمدیدار جو گورنمنٹ کے بر سر اقتدار ارکان کی ذاتی زندگی کے مسائل پر گفتگو کر رہے تھے، ٹیلیفون پر سینما کی سیشنیں بک کرا رہے تھے اور اپنے مہمانوں سے ملک کی معاشی بدحالی کا گلہ کر رہے تھے اور بڑے بڑے صنعت کارجو اپنے مزدوروں کی ہالیں پغمب غصہ کا اظہار کر رہے تھے اور انہوں کے کھوکھوں سے سرکاری عمدیداروں کے بنگلوں کو تاک رہے تھے۔ ان کی جوان ہوتی ہوئی دوسری نسل چھوٹی چھوٹی نیلوں میں بیٹی سرکوں پر سرگردان تھی۔ کھٹے کی ترش خوشبودار باڑوں کے سائے میں سگرنوں کے کش لگائے جا رہے تھے اور سرکوں پر پوری رفتار سے سکوڑ دوڑائے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے ایک جگہ پر رک کر اس نے ایک بار پھر ذہن پر زور دے کر مستقل پیچھا کرتی ہوئی اس دھن کو یاد کرنے کی کوشش کی مگر اس کا مقام ماضی اس کی گرفت میں نہ آنا تھا نہ آیا۔ دو سکوڑ دوڑ لگاتے ہوئے زن سے اس کے پاس سے گزر گئے۔ اس نے پر حضرت نظروں سے ان کا تعاقب کیا اور پل کے پل کو اس کی آنکھوں میں وہ ناچی ہوئی چمک لوٹ آئی اور اس کا بازو بے اختیار صدا کے انداز میں ان کے پیچھے اٹھ گیا اور وہ بہت آہستہ سے، تقریباً نرمی سے بولا: ”زندہ باد۔“ وہ چلا چلا کر سب کو سنا کر اس ماتحتی سفر میں ان سنہری جوانیوں کو آشیرباد دینا چاہتا تھا مگر ابھی ابھی اسے پتا چلا تھا کہ اس کا دل مر چکا ہے۔ دل جو بڑی لمبی اور اوپنجی اڑان والا، بڑا ہی شہپر اور جری پرندہ تھا۔

جب وہ اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول کر پچکے سے اندر داخل ہوا تو اس کا بچہ زمین پر بیٹھا ایک پتلی سی کتاب کے ورق الٹ رہا تھا۔ کچن سے برتنوں کے بجھے کی اکاڈ کا آوازیں آ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر بچے کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ دونوں

ہاتھ پھیل کر بولا: ”ابا۔“

”گذو۔“ اس نے پیار سے پکارا۔ پھر وہ اس کے پاس بیٹھ گیا: ”کیا کر رہے ہو؟“

”پڑھ رہا ہوں۔“

”ڈی ڈی ڈی ڈی ڈی۔“ بچے نے شرارت سے آنکھیں چمکاتے ہوئے دوہرائے۔

”ڈو ڈل ڈو ڈل ڈو ڈل ڈاہ۔“

”ڈو ڈل ڈو ڈل ڈو ڈل ڈاہ۔“

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ جمال کچن کے دروازے سے جھانک کر مسکرائی اور واپس چلی گئی۔

”کیا کر رہے ہو بیٹھے؟“ اس نے پوچھا۔

”ایک بار کہا ہے پڑھ رہا ہوں۔“

”ارے! یہ پڑھنے کب سے لگے؟“

”یہ انگل نے دی ہے۔“ بچہ کتاب اس کی ناک کے نیچے ٹھونس کر بولا۔

”کس نے؟“

”انگل ریاض نے۔“

اس نے کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کی جلد پر لکھا تھا: ”بچوں کے لئے زریں اقوال۔“

”ہا ہا۔“ وہ ورق اٹھنے لگا۔

”ہا ہا۔“ بچے نے نقل اتاری اور بازو اس کی گردن میں حماکل کر کے جھولنے لگا: ”میں اس کو پڑھ لیتا ہوں۔“

”ارے واہ۔ آپ کو الف بے تو ابھی آتی نہیں۔“

”میں اس کو پڑھ لیتا ہوں۔“ بچے نے سختی سے کہا۔

”اچھا پڑھو۔“

”یہ ہے: ہمیشہ سچ بولو۔“

”ارے!“ وہ چونک پڑا: ”یہ آپ نے پڑھنا کب سے شروع کیا بھی؟“

”یہ انگل ریاض نے لے کر دی ہے۔“

”ہا ہا۔“ اس نے کتاب فرش پر رکھ دی: ”آپ کو الف بے تو ابھی آتی نہیں۔“

”میں اس کو پڑھ لیتا ہوں پڑھ لیتا ہوں پڑھ لیتا ہوں۔“

”شوکی۔“ جمال کچن کے دروازے پر نمودار ہوئی: ”گڈو کا ذہن بڑا ہی اچھا ہے۔“

”اچھا؟“

”ہا۔“ وہ اس کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گئی: ”میں نے ایک بار بس بتایا ہے اور اسے ازبر ہو گیا ہے۔“

”ہا ہا۔“

”گڈو ابا کو پڑھ کر سناؤ۔“

”یہ ہے: ہمیشہ سچ بولو۔“ بچے نے کہا۔

”ہا۔“

”یہ ہے: ”محنت سے کام کرو۔“

”ہا ہا۔“ اس نے پیار کے مارے جھک کر اپنے بچے کو ماتھے پر چوما: ”ڈو ڈو ڈو ڈاہ۔“

”ڈو ڈو ڈو ڈاہ۔“ بچے نے دو ہرا یا۔

”ڈی ڈل ڈی ڈل ڈو۔“

”ڈی ڈل ڈی ڈل ڈو۔“

دونوں قسمہ لگا کر ہنس پڑے۔ اس نے ”ڈل ڈل ڈل“ کی گردان کرتے ہوئے بچے کے گدگدی کرنی شروع کر دی۔ بچہ ہستا ہوا فرش پر قلا بازیاں کھانے لگا۔ لڑھکتا لڑھکتا وہ دور تک چلا گیا۔ دیوار کے پاس پہنچ کر اس کا ہاتھ ایک ٹوٹے ہوئے کھلونے پر پڑا۔ وہ اسے اٹھا کر کچھ دیر تک خاموشی سے دیکھتا رہا، پھر چلا اٹھا:

”ابا میرا جہاز ٹوٹ گیا۔“

”ارے یہ کیسے ٹوٹ گیا؟“

”بس ٹوٹ گیا۔“ بچے نے کہا: ”ابا ہمیں جہاز بنانا کر دو۔“

”جہاز بننا کرو دیں؟“

”ہمیں جہاز بننا کرو دیں۔“

”اچھا۔“ اس نے کتاب سے ورق پھاڑ کر جہاز بنانا شروع کیا۔

”ابا“ بچا چیخا: ”اس کا نہیں، اخبار کا۔“

”اخبار کا؟“ وہ جہاز بناتا رہا۔

”ابا آپ نے ہمارا“ ہمیشہ سچ بولو“ پھاڑ دیا ہے۔“

اس نے جہاز بنانا کر دو انگلیوں میں پکڑا اور منہ سے ”زوم“ کی آواز نکال کر زور سے ہوا میں پھینکا۔

”ابا ہم کو دیں۔“ بچہ ہاتھ پھیلا کر اس کے پیچے بھاگا جہاز کھڑکی کے راستے تیرتا ہوا نیچے سرٹک کی طرف پرواز کر گیا۔ بچے نے خوشی سے تالی بجائی۔ وہ دوسرا ورق پھاڑ کر جہاز بنانے لگا۔

”ابا اس کا نہیں۔“ بچہ چیخا: ”ابا آپ نے ہمارا محنت سے کام کرو، پھاڑ دیا۔“ ”ارے ہاں یار۔“ وہ اکتا کر بولا: ”ہم نے بھی پڑھا تھا۔“ اور جہاز بناتا

رہا۔

”ہم کو دیں — ابا ہم کو دو۔“ بچہ چلایا۔ پھر اس نے باپ کے ہاتھ سے جہاز لے کر اسے دو انگلیوں میں پکڑا اور منہ سے ”زوم — زوم“ کی آوازیں نکال کر اسے کمرے میں اڑانے اور تالیاں بجانے لگا۔

جمال، جو اس اٹھا میں واپس کچن میں جا چکی تھی، دوبارہ دروازے پر نمودار ہوئی اور بولی: ”شوکی کھانا تیار ہے۔“

”ارے جیتی رہو فاختہ۔“ وہ بولا: ”مجھے بھوک لگ رہی تھی۔“

اس نے خاموشی اور تندی سے کھانا کھایا۔ کھانا ختم کرنے کے تھوڑی ہی دیر بعد بچہ ماں کی گود میں پڑا سو گیا۔

جب وہ بتیاں بجھا کر سونے کے لیے لیئے تو کمرے میں سخت جس ہو رہا تھا اور کئی پتنگے ادھر ادھر تاریکی میں دیواروں اور کھڑکیوں کے شیشوں پر سرما رہے تھے۔

”نمیں شوکی۔“ پھر جمال کی آواز آئی: ”آؤں ہنک۔“

”میری فاختہ — میری نسخی سی فاختہ۔“

”ہائے شوکی — تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”میری جان فاختہ۔“ وہ خوشامد کے لمحے میں بولا: ”میری جان فاختہ۔“

”خدا یا!“ اس نے زاری کی: ”خدا یا!“

اگلے روز سوریے وہ ریاض کے ڈرائیگ روم میں بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ریاض، سفید فلاں کی پتلون اور زرد پولو شرت پہنے، صوفے پر نیم دراز پچھلے ایک گھنٹے سے مستقل ٹیلیفون پر اپنے آفس سے بات کر رہا تھا۔ گذو اکیلا اکیلا برآمدوں میں پھرتا ہوا آکر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”امی“ وہ بولا: ”میں سڑک پر چلا جاؤں؟“